© rasailojaraid.com

عشق اور اردو شاعری میں عشقیہ رجحانات

جناب سعید احمد خاں صاحب ایم، اے، ٹونک

اردو شاعری کا خمیر عشقیہ ہے۔ اس کی بنیاد عاشقانہ مضامین پر ہے۔ اگر عاشقانہ مضامین وخیالات کو اس سے خارج کر دیا جائے تو شاعری بے کیف و بے جان ہو جائے گی۔ مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں اردو کی عشقیہ شاعری پر سخت تنقید کی ہے۔ حالی کا لہجہ تلخ تھا مگر اس میں خلوص تھا۔ ان کی تنقید اصلاحی تھی۔ اکثر لوگ عشق کو معاملہ بندی تک محدود کر کے اردو شاعری پر تنقید کرنے لگے۔ مغربی تعلیم اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اخلاقی، افادی اور سماجی حیثیت سے تنقید کی جانے لگی۔ کیا عشق لائق اجتناب ہے؟ امیر خسرو سے ناصر کاظمی تک عشقیہ شاعری کا سلسلہ ہے۔ زمانی و مکانی بُعد ہوتے ہوئے بھی ان سب نے شیوہ عشق کیوں اختیار کیا؟ کیا عشق صرف جنسی معاملات تک محدود ہے؟ بقول شیخ سعدی ؒ دور ایام جوانی چنانکہ افتد و دانی، اس طرح عشق "ذاتی نوعیت" میں محدود اور "ایام جوانی" میں محصور ہو جاتا ہے اور ہر شخص عمر کے ایک حصہ میں اس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میر کے قول کے مطابق سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق یعنی ماسوائے عشق، عالم کچھ بھی نہیں۔ نظام عالم عشق سے ہے۔ آخر عشق کیا ہے؟ اس کے متعلق متضاد و مختلف آراء و اقوال کیوں ہیں؟ ان سب باتوں کو جاننے کے لئے عشق کی ماہیت اور لوازمات پر غور کرنا ضروری ہے۔

عشق عربی لفظ ہے۔ المنجد میں اس کے معنی لکھے ہیں، محبت کی زیادتی، پارسائی اور غیر پارسائی دونوں طرح ہوتی ہے۔

صراح میں تحریر ہے۔ عشق بالکسر از حد درگذشتن دوستی، منتخب اللباب کے مطابق، لبیار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوست داشتن چیزی۔ صاحب غیاث اللغات نے منتخب کی مذکورہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد تحریر کیا ہے کہ " نزد بعضے اطبا مرضیست از قسم جنوں کہ از دیدن صورت حسین پیدا می شود " عبدالرزاق شارح ظہوری نے شرح اسباب و فتوحات الحکم سے نقل کیا ہے کہ عشق ماخوذ از عشقہ واں نباتے است کہ آنرا لبلاب گویند۔ چوں بر درختے بہ پیچد آنرا خشک کند ہمیں حالت عشق ست بر ہر دے طاری شود صاحبش راخشک وزرد کند۔

فرہنگ آصفیہ میں درج ہے۔ عشق (ع) اسم مذکر (۱) کسی چیز کو نہایت دوست رکھنا از حد محبت نیہ، پیار، پریم، پریت، حُب ہے

لگا تھا نہ بس عشق کو اس تیر لگی کھینچنے آہ بدرِ منیر (میر حسن)

(۲) شوق، آرزو، چاہ، خواہش، رغبت (۳) عادت، لت، دھت

(۴) ایک قسم کا جنوں و سودا جو خوبصورت آدمی کو دیکھنے سے ہو جاتا ہے

کیا کہوں تم سے میں کیا ہے عشق جان کا روگ ہے بلا ہے عشق (امیر)

مندرجہ بالا معنی و تعریفات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عشق محبت میں حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے۔ یہ میلان طبیع ہے۔ عشق محبوب کے ساتھ متحد ہونے کا سخت شوق ہے۔ اگر عقل و خرد ہوش و ہواس سے بیگانہ کر دے تو جنوں نام ہو جائے گا۔

ہمارے شعرا اس میلان طبیع کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

عشق سے تو نہیں ہوں واقف دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے (سودا)

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرتا ہے (میر)

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے (جگر)

عشق کا لفظ قرآن، حدیث اور شعرائے جاہلیت کے کلام میں نہیں آیا ہے۔ متاخرین شعرائے عرب نے بھی اس لفظ کو بہت کم استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین نے اپنے تحقیقی مقالہ "اردو شاعری میں عشقیہ تصور اور روایت خسرو دہلوی سے سراج اورنگ آبادی تک" میں تحریر کیا ہے کہ شیخ ابن عربی نے کہا ہے کہ قرآن میں عشق کو محبت کی شدت قرار دیا ہے ڈاکٹر موصوف نے ابن عربی کے قول پر دو لفظ قرآن میں، اضافہ کئے ہیں، اصل مقولہ ہے۔ العشق تجاوز عن الحد فی المحبتہ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ جلال الدین دوانی نے بھی سہواً ایک مقولہ کو اخلاق جلالی میں حدیث تحریر کیا ہے۔

"من عشق وعف وکتم مات مات شہید؟"

عشق کی وہ خصوصیات جو فارسی شاعری میں نظر آتی ہیں ان کا تو عربی شعراء کے کلام میں وجود ہی نہیں ہے۔ اردو شاعری کو خیالات و مضامین فارسی شاعری سے ورثہ میں ملے ہیں اس لئے اجمالاً فارسی شاعری کے تناظر میں عشق کی ماہیت کیفیت اور اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

کیا جمال عشق کا مبداء ہے؟ کیونکہ عشق کی تعریف میں یہ بھی کہا گیا ہے یہ ایک قسم کا جنوں ہے جو خوبصورت آدمی کو دیکھنے سے ہوجاتا ہے۔ حسن سے عشق ہے یا عشق سے حسن۔

گلستاں باب پنجم 'در عشق و جوانی' میں شیخ سعدی نے مجنوں کی زبانی کہا ہے کہ از دریچہ چشم مجنوں بایستی در جمال لیلیٰ نظر کردن۔

اس طرح شیخ سعدی ان حکماء کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو کہتے کہ حسن کا تعلق خارج سے نہیں بلکہ خارج پر نظر ڈالنے والوں کی داخلی کیفیت ہے۔ کوئی شئے بذات خود حسین نہیں بلکہ انسان کی توجہ اور نظر کشائی پر منحصر ہے۔ اس کے برعکس نوافلاطونی فلسفہ جمال سے تعلق رکھنے والے حسن کو اشیاء کی ذاتی صفت قرار دیتے ہیں۔ حسن اپنے اثبات کیلئے حسن نظر کا محتاج نہیں، حسن کا وجود مطلق ہے۔ غالب نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس نظریہ نے وحدت الوجود کا نام پایا ہے۔

حقیقت ان دونوں نظریات کے بین بین ہے۔ حسن نہ یکسر خارجی ہے اور تمام تر داخلی۔ دونوں کے ربط باہمی سے حسن کا تعلق ہے۔ حسن متناسب الاعضاء ہونے کا ہی نام نہیں اس میں حسن عمل بھی داخل ہے۔ خارجی اشیاء کے مشاہدہ سے انسانی جذبات میں تموج پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس حرکت و تموج سے حظ و لطف حاصل ہو تو حسن کہلاتا ہے۔ کوئی بھی ادا جذبات کو برانگیختہ کرکے آتش عشق کو روشن کرسکتی ہے۔ ادا ہی وہ عمل ہے جس سے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ عاشق کی نظر عرفانِ حسن و جمال اور جذبات کا تہیج پیدا ہوتا ہے جو معشوق کا احترام تکریم و توقیر سکھاتا ہے۔ اس سے شادمانی اور علم و لیقین پیدا ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فارسی شاعری میں عشق کا اہم مقام ہے۔ عباسی دور حکومت میں یونانی کتب کے کثرت تراجم ہوئے۔ یونانی مفکرین ارسطو، افلاطون وغیرہ کے خیالات سے مسلم اذہان متاثر ہوئے اور فلسفۂ اشراق وجود میں آیا۔ اشراقی فلسفیوں نے عشق کو نظام عالم کی بنیاد قرار دیا ہے۔ ابن عربی نے اسے نظریہ کے طور پر وحدت الوجود کی شکل میں پیش کیا۔ شعراء اور اصفیاء کو عشق مجازی اور عشق حقیقی کے مضامین مل گئے۔ عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ بنا دیا گیا۔ دنیا کی بنیاد عشق و محبت پر ہے۔ یہاں علت و معلول کا سلسلہ ہے۔ ہر معلول اپنی علت سے عشق رکھتا ہے اور علت کو اس پر غلبہ واقتدار حاصل ہے۔ اس لئے ہر شئے علت و معلول ہوئی۔ اس لئے ہی قہر ومہر کی صفات ہر شے میں پائی جاتی ہیں۔ پروانہ و شمع، ماہ و کتاں، گل و بلبل سب باہم عاشق ومعشوق ہیں۔ علت معشوق اور معلول عاشق۔ اسی جذب وانجذاب سے عالم قائم ہے۔ ستاروں میں کشش اور مہر و ماہ کی گردش اسی نظام عشق سے قائم ہے۔ زمین پر سب سے زیادہ اثر آسمان کا ہوتا ہے، زمین کی پیداوار موسم کا تغیر، رنگوں کا اختلاف، مزاجوں کا فرق وغیرہ اسی کا نتیجہ ہیں اس لئے زمین معلول اور آسمان علت ہے، شعراء آسمان میں قہر بتلاتے ہیں۔ اور اس کے ظلم کا بیان کرتے ہیں۔ علت میں غلبہ اور معلول میں عجز و مسکنت ہوتی ہے اس لئے عاشق میں مسکنت و عجز اور معشوق میں کبر و غرور ہوتا ہے۔ علت و معلول کا سلسلہ چونکہ خدا پر ختم ہو جاتا ہے اس لئے خدا اپنی ذات پر خود عاشق ہو کر معشوق ہو گیا ہے۔ حسن وجمال، محاسن و فضائل کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ اسی کے فیض کے پرتو سے کائنات روشن اور اشیاء حسین ہیں۔ خدا کا حسن ذاتی ہے جہاں کی اشیاء کا حسن مستعار ہے اس لئے عارضی ہے۔

علامہ جلال الدین دوانی نے اخلاق جلالی میں عشق کی دو قسمیں لکھی ہیں۔

(۱) عشق بہیمی۔ جس کے لئے لکھا ہے کہ عشق از جملہ امراض شہوت شمردہ اند۔ ہماری مثنویوں اور غزلوں میں بکثرت اشعار اسی عشق بہیمی کے ہیں۔ اس کو جنسی عشق بھی کہا جا سکتا ہے۔

(۲) عشق نفسانی جس کے متعلق تحریر کیا ہے کہ مبدأ آں تناسب روحانیت و عدالت رذائل نیست بلکہ از فنون فضائل است۔ شاعری کے اعلیٰ وارفع مضامین اسی کے ذیل میں آتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اکبر کے دور حکومت سے ہندو مذہب کے احیار کی ابتدار ہوئی اور مغلیہ سلطنت کے زوال میں اردو شاعری کا فروغ ہوا۔ ہندوی فلسفہ و فکر کے اثرات مسلمانوں پر بڑھے اس کے ساتھ ساتھ اسالیب اور بیان پر بھی اس کا اثر پڑا۔ صنف نازک کی طرف سے اظہار محبت اسی کا نتیجہ ہے۔ فارسی شاعری میں صنفِ "حجاب" میں تھی اس کا تعلق تذکیر و تانیث سے نہ تھا بلکہ جذبہ سے تھا جو عشق کا اظہار چاہتا تھا۔

صاحب شعرالہند مولوی عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ معتصم باللہ کے زمانہ میں ترکوں کو بکثرت فوج میں داخل کیا گیا۔ ایران میں ترک بچے جو قدرتی طور پر شہسوار، تیر انداز اور سفاک اور خوں ریز تھے۔ ابتدار ہی سے معشوق بن گئے تھے اس لئے شہسواری، تیراندازی اور سفاکی کے مضامین معشوقوں کی صفت میں داخل ہوگئے۔ اولاً تو یہ اوصاف سرے سے ہی شان محبوبیت کے منافی ہیں اردو شاعری میں آکر واقعیت سے بھی دور ہو گئے۔ تصوف کی گرم بازاری نے امرد پرستی کو عام کر دیا اس قسم کے مضامین سے شعراء کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ صوفیانہ تعشق کا اظہار مذہب سے متعلق نہیں جذبۂ عشق سے ہے اور جذبۂ عشق کا منبع حضرتِ دل ہیں جس کی کارفرمائی کا دائرہ وسیع ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

شاعری کیا ہے؟ دل جذبات کا اظہار ہے دل ہی نہیں تو شاعری بیکار ہے

جن نظریات و رجحانات کا مجملاً ذکر کیا گیا ہے ان کا اثر اردو شاعری پر کیا پڑا اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ سے لے کر غالب تک فارسی شاعری کے روایتی رجحانات و نظریات کا وہی سلسلہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یعنی اشراقی اور بہیمانہ (صوفیانہ اور جنسی) دونوں ہی کیفیات دل سے متعلق تھیں۔ صوفیانہ شاعری یا عشق حقیقی کے نمائندہ شاعر خواجہ میر درد ہیں۔ اگرچہ دیگر شعراء کا کلام بھی اس قسم کے مضامین سے خالی نہیں ہے اردو شاعری کے دامن میں اعلیٰ عشقیہ مضامین کے موتی اپنی چمک دمک سے عجب لطف دیتے ہیں ؎

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے (میر) دریا دریا روتا ہوں صحرا صحرا وحشت ہے

ہے حسن ترا ہمیشہ یکساں (درد) جنت سے بہار کیونکر جاوے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صبر بن اور کچھ نہ لو ہمراہ (قائم) کوچۂ عشق تنگ ہے یارو
جاتی ہے نسیم ادھر گلی کو (قائم) اُٹھ سکئیے تو قافلہ ہے بہتر
کچھ گریباں نہیں کہ ہر ساعت (مصحفی) چاک کر کے سلائیے دل کو

مومن کے یہاں 'غزل' سب سے محدود دائرہ میں ہے۔ یہاں عشق ہجر و وصال کی کیفیات پر مشتمل ہے۔

اب ذرا پیمانہ پہلو بھی ملاحظہ ہو پہلے پیمانہ غیر فطری عشقیہ شاعری کا ذکر کیا جاتا ہے۔
تذکرہ میر حسن میں لکھا ہے کہ میاں صلاح الدین پاکباز قوال بچہ مکھن پر عاشق تھے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بہیں ندیاں مرے آنسو سے جو میں ہجر میں رویا　　　کہے ہے ساری بستی ہائے مکھن نے ہمیں کھویا

صوفیہ جن نوخیزوں کو اپنا منظور نظر بناتے تھے ان کو منظر کہتے تھے۔ یہ اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ جس سے وہ محبت کرتے ہیں وہ مظہر ذات خداوندی ہیں۔ نیک چند بہار نے بعینہ اسی معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے ؎

تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس　　　یہ عجب مظہر ہے جن کے مبتلا ہیں مرد و زن

خواجہ درد فرماتے ہیں ؎

گر دیکھئے تو مظہر آثار بقا ہوں　　　اور سمجھئے جو عکس مجھے محو فنا ہوں

میر کو بچپن ہی سے عشق کرنے کی نصیحت کی گئی تھی۔ ناکام عشق نے رسوا بھی کیا اور اسی کے سوز و گداز نے ناخدائے سخن بنا دیا۔ ان کی بیماری کا حال بھی سنئے ؎

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب　　　اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

طباطبائی نے لکھا ہے کہ میر نے تو اس باب میں ایسی افراط کی ہے کہ جا بجا ان کے دیوان میں ولی کے لونڈے بھرے پڑے ہیں۔

ولی در مدح امرت لعل فرماتے ہیں ؎

لعل تیرے بھرے ہیں امرت سوں　　　نام تیرا بجا ہے امرت لعل

یہ چند اشعار بطور نمونہ غیر فطری بہیمی یا جنسی تلذذ کی شاعری کے دئے گئے ہیں جس کے ڈیرے ڈانڈے تصوف نے عشق الٰہی سے ملا دئے ہیں۔ اب ذرا فطری بہیمانہ عشق کا بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لطف لیجئے۔ خواجہ آتش فرماتے ہیں ؎

عورت بن کر مرے پاس آئیو لے عزرائیل　　مرد ہوں عشق رکھتا ہوں زنِ خوشرو سے

ان تینوں رجحانات عشق کے اعلیٰ مضامین (بقول روانی نفسی شاعری) بہیمانہ فطری، بہیمانہ غیر فطری غالب تک ملتے ہیں، تینوں رجحانات کا تعلق دل سے ہے یا ماورائی کیفیت سے۔ حقیقتاً یہ ماورائی کیفیت بھی دل پر طاری ہوتی ہے گویا غالب تک شاعری کا رجحان دل کے تحت تھا۔ غالب کو شکست و ریخت کا زمانہ ملا۔ نئی تہذیب اپنے پیر جما رہی تھی۔ کلکتہ میں وہ اس کا جلوہ دیکھ آئے تھے۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ گل و بلبل کے مضامین سے شاعری دلآویز مرقع نہیں بن سکتی نہ ہی اس روایتی داستانِ دل سے اپنی اہمیت منوا سکتے ہیں۔ غالب کی عظمت کا راز یہی ہے کہ انہوں نے زمانہ کی رفتار کو پہچانا۔ پرانی تہذیب دم توڑ چکی تھی جس سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ لیکن جو حقیقت کو نہ پہچانے وہ نظر کیا ہے؟ غالب کے کلام میں ایک فکر ہے جس کا اظہار پہلے نہیں ہوا تھا ایک ذہن ہے جو ان سے پہلے ناپید تھا اگرچہ ان کے یہاں روایتی، رسمی مضامین بھی ہیں جن کو اپنے طرز بیان سے جلا بخشی ہے مگر غالب کی عظمت عشقیہ شاعری میں فکری رجحان کی وجہ سے ہے۔ دل و دماغ کی حسین امتزاج غالب کے اشعار میں ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل　　جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی

سرسید کی تحریک سے عقلی رجحانات بڑھے گویا قدیم نظریۂ عشق کا رد عمل تھا۔ یہ "عشق" تقلیدی، جامدانہ فکر سے خالی تھا۔ سرسید نے اصلاح کی کوشش میں تاریخی، مذہبی اور تہذیبی ورثہ کو نظر انداز کر دیا۔ یورپ کی تقلید میں عقل کی پیروی کرنے لگے۔ شبلی نے اسی لئے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ انہیں اپنی تہذیبی ورثہ سے عشق تھا۔ اکبر کی مخالفت کا سبب بھی یہی تھا۔ اکبر شرق کے دلدادہ تھے۔ ان کو مشرقی اقدار و تہذیب سے پیار تھا۔ ان کا تفکر مشرقیت کے عشق کے تابع تھا اسی لئے ان کا اظہارِ خیال کا موضوع حادثات، واقعات رہے۔ ان کے یہاں حکیمانہ نظر اور فلسفیانہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ربط نہ تھا۔

اقبال کی شاعری میں غالب کا ذہن اور اکبر کا تفکر، شبلی کا مذہبی احساس اور حالی کا سوز ملتا ہے اگر غالب نہ ہوتے تو اقبال بھی نہیں ہوتے۔

اقبال کے نظام فکر وفن میں عشق کو مرکزی اہمیت ہے۔ عشق ایک نعمت الٰہی ہے۔ عشق میں عقل کے تذبذب اور چوں چرا کی گنجائش نہیں اقبال کا تصور عشق دوسرے شعراء کے متصوفانہ یا رسمی عشق سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے یہاں عشق ایک زبردست محرک عمل ہے تقدیر پرست ہو کر رہنے والے عمل کا نام نہیں۔ یہ عشق وصل پر ختم نہیں ہوتا نہ عشق قطرہ کی طرح دریا میں فنا ہونے کا نام ہے۔ دریا میں ملکر عشق کی بدولت قطرہ آبدار موتی بنتا ہے اس میں قلزم کی سی وسعت پیدا ہو جاتی ہے، اقبال کا عشق خود آگہی کا سرچشمہ ہے۔ یہ عشق عقل سے بدرجہا برتر ہے۔ اس میں جرأت اور قوت عمل ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اقبال کے عشق کے تصور کو سمجھنے کے لئے ان کی نظم "محبت" اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کے کلام میں عشق و عقل کا جگہ تقابل ہے۔ دراصل یہ سرسید کی عقلی تحریک کا ردعمل ہے ؎

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل　　　عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات　　　علم مقام صفات عشق تماشائے ذات

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق　　　عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

غالب نے عشق کو نیا ذہن و فکر دیا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے اثر سے عشق کی جگہ عقل نے لے لی تھی۔ اقبال نے پھر عقل سے عشق کی طرف راغب کیا۔ غالب اور اقبال کی عظمت کا راز یہی ہے کہ دونوں بندھے ٹکے راستے پر نہیں چلے۔ انہوں نے اپنی راہ الگ نکالی۔ غالب کے یہاں پیش رفت ہے تو اقبال کے یہاں رجعت مگر توانائی اور قوت کے ساتھ۔ ان کا عشق حرکی ہے جبکہ میر کا عشق قنوطی تھا۔ اسی رنگ نے بعد میں فانی کے یہاں یاسیت کا روپ دھار لیا۔ حسرت کا عشق جسمانی ہے، اصغر کا عشق ماورائی کیفیت کا حامل ہے جس کا سلسلہ خواجہ میر درد سے ملتا ہے۔ اختر کی رومانویت میں قدیم داستانوی ماحول ہے۔ یہ عشق سراسر جسمانی ہے یہاں تعقل پر جذبہ حاوی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ جگر کے یہاں عشق میں سرشاری اور مستانہ ادا ہے مگر فکر اور گہرائی نہیں۔

اردو کی عشقیہ شاعری میں غالب وہ سنگ میل ہیں جہاں سے سے عشق کو فکر کی نئی راہ ملتی ہے۔ یہ فکر کی راہ تعقل کے دروازے کھول دیتی ہے۔ تعقل جذبہ، حرکت و عمل سے محروم کرنے لگتا ہے تو اقبال عقل کو عشق کی راہ پر گامزن کر دیتے ہیں۔ اقبال اور غالب کے عشقیہ رجحان صحت مندی کی علامت اور بصیرت کے حامل تھے۔ باقی غالب سے پہلے اور اقبال کے بعد کے شعراء کا کوئی نیا عشقیہ رجحان نہیں معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ پرانے رجحانات ہی ان کے یہاں ملتے ہیں۔ یہ معمولی تغیر و تبدل جادہ راہ ہیں شاہراہ نہیں۔ غالب و اقبال سے بڑا شاعر اب تک اردو زبان پیدا نہیں کر سکی ہے۔ دیکھئے اردو کی عشقیہ شاعری کو نیا رجحان دینے والا کب پیدا ہو؟ انتظار ہے ظہور مہدی کا۔

(ختم شد)

امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق

تالیف: سید حسین قادری شور، ایم اے عثمانیہ یونیورسٹی

مشہور و معروف محقق اور صوفی و فلسفی حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی شخصیت نہ صرف مسلمانوں اور ایشیا میں بلکہ غیر مسلموں اور یورپ میں بھی مسلم ہے زیر نظر تالیف اپنے مضامین و مباحث کی جامعیت اور حسن ترتیب اور عام معلومات کے اعتبار سے ایک بہترین کتاب ہے۔

امام غزالیؒ نے اپنے زمانے کے علمی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور سیاسی حالات کا جس گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ کتاب کے پہلے حصہ میں ان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے فلسفۂ مذہب پر تحقیقی گفتگو کی گئی ہے اور تیسرے حصے میں فلسفۂ اخلاق پر، چوتھے حصے میں ان کے فلسفۂ مذہب و اخلاق پر ایک جامع اور بصیرت افروز تبصرہ ہے۔

صفحات ۵۰۰ تقطیع متوسط ۲۰×۲۶/۸

قیمت ۵۰/- روپے مجلد ۱۰۰/- روپے

© rasailojaraid.com